خالد امین☆

شبلی اور سیّد احمد خان کے اختلافات اور شبلی کی بین الاسلامی مراجعت

The difference of opinion between Shibli No'mani and Sir Syed Ahmed Khan: Shibli's retreat towards an Islamic point of view

By *Khalid Ameen, Assistant Prof, Department of Urdu, University of Karachi.*

The cardinal difference between Sir Syed Ahmed Khan and Shibli No'mani was the mindset: Syed Ahmed Khan was basically a pro-West modernist bent upon changing the ways the people and specifically the Muslims of the subcontinent believed in certain things. Shibli, on the other hand, though not totally against the West, always stressed the Islamic roots of the Muslims of the subcontinent. Shibli felt that a combination of both eastern and western philosophies and values could help regain the lost glory of the Muslims. This article traces Shibli's turning towards Islamic models and finds the influence of certain personalities that helped mould Shibli's thoughts to a great extent.

سید احمد خاں کے تعلیمی ادارے علی گڑھ میں مذہبی تعلیمات میں توازن پیدا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ کالج میں روایتی اندازِ فکر کو بھی جاری رکھا جائے۔ چناں چہ علی گڑھ تحریک میں روایت کو فروغ دینے میں سب سے اہم نام شبلی نعمانی کا ہے۔ سید احمد خاں کے برعکس ان کے لیے بین الاسلامیت کے نظریے میں زیادہ کشش تھی۔ انھوں نے ۱۸۹۳ء میں ترکی کا سفر کیا، اور سلطان عبد الحمید نے انھیں ''تمغۂ مجیدیہ'' سے بھی نوازا۔[1] ترکی میں انھوں نے

☆ استاد، شعبۂ اردو، جامعۂ کراچی

عثمان پاشا سے ملاقات کی، اس نے پرتپاک استقبال کیا اور اپنی عکسی تصویر بھی عنایت کی، تمغے کے ساتھ ایک فرمان بھی دیا جو ان کے سفرنامے میں موجود ہے۔(۲)

سید احمد خاں کے رفقا میں شبلی پہلے شخص تھے جنھوں نے جمال الدین افغانی اور ان کے شریک کار شیخ محمد عبدہٗ سے قاہرہ میں ملاقات کی اور باہمی روابط پیدا کیے۔(۳) شبلی کا سیاسی شعور سید احمد کے سیاسی نظریات پر ایک اضافہ ہے۔ سید احمد خان کے ہاں قوم کا تصور تو ضرور ہے لیکن انگریزوں سے کسی آزاد وطن کے حصول کا نہیں۔ شبلی نے قوم کے تصور کے ساتھ انگریز دشمنی کا تصور بھی دیا۔ سید احمد جب کالج کھولتے ہیں تو اس کا نام ''اینگلو محمڈن'' رکھتے ہیں اور شبلی اس پُرآشوب دور میں بھی اپنے اسکول کا نام ''نیشنل اسکول'' رکھتے ہیں۔ سید احمد علی گڑھ میں عمارتوں کے نام انگریزوں کے نام پر رکھتے ہیں اور ان کے یہاں وائسرائے اور گورنر مہمانِ خصوصی ہوتے ہیں۔ شبلی کے ندوہ میں بین الاقوامی اسلامی اتحاد کے رہنما اور مشہور مصری اخبار المنار کے مدیر رشید رضا بلائے جاتے ہیں۔ سید احمد خان نے اپنی ایک تقریر میں اس بات کا اعادہ کیا کہ ''ہندوستان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہندو اور مسلمان حاکم ہوں اور امن قائم رہ سکے''(۴) لیکن مقالاتِ شبلی میں مسئلہ آرمینیا(۵) اور اسی قسم کے دوسرے مضامین میں اور شبلی کی بیش تر نظموں کو پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ شبلی انگریز حکومت کے سخت مخالف تھے۔(۶)

شبلی نے قوم کی اصلاح کے لیے جو نظامِ فکر و عمل ترتیب دیا اس میں دو باتیں نمایاں ہیں اوّل یہ کہ ملّتِ اسلامیہ ایک قوم ہے جو ابدی ہے مخصوص ماحول میں ہمارا طریقِ کار کتنا ہی محدود ہو نصب العین بہرحال عالم گیر ہونا چاہیے۔(۷) دوم یہ کہ شبلی نعمانی نے بین الاسلامیت کے نظریے کو فروغ دینے کے لیے ہندی مسلمانوں کے تہذیبی و تمدنی اشتراکِ عمل کو تاریخی حوالوں سے دیکھا۔

ہندوستان میں جمال الدین افغانی کے نظریۂ بین الاسلامیت کو ۱۹۱۳ء۔ ۱۹۱۲ء میں ابوالکلام آزاد نے ترقی دی جو المنار جماعت سے راست تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے الہلال اور البلاغ نامی رسالوں میں، جو وہ کلکتہ سے شائع کرتے تھے، مضامین کے ایک سلسلے میں اور پہلی جنگِ عظیم کے بعد اپنے خطبات میں برابر اس کی ترویج کی، بلکہ ان دونوں رسالوں کو انھوں نے تحریکِ اتحادِ اسلامی کے لیے مختص کر دیا، مگر علی گڑھ تحریک کے خلاف انھوں نے جو کچھ لکھا، اسے افغانی اور شبلی کی شخصیت کا حصہ قرار دیا جاسکتا ہے۔(۸) اس کی وجہ یہ ہے کہ شبلی اور ابوالکلام آزاد گہرے دوست تھے اور دونوں کے رجحانات میں کافی یکسانیت بھی پائی جاتی تھی۔

شبلی نے علی گڑھ سے الگ راہ کیوں اختیار کی اس سوال کا جواب اتنا پیچیدہ بھی نہیں، شبلی کی خاص طبیعت اور نفسیاتی ساخت کے دخل کے علاوہ بعض خارجی عوامل بھی ایسے تھے جس نے انھیں علی گڑھ تحریک سے دور کر دیا اور ان میں ایک

بڑی وجہ افغانی اور شیخ محمد عبدہٗ کی تحریک اور شخصیت کا اثر تھا۔(۹)

شبلی نعمانی علی گڑھ میں ہی تحریک اتحاد اسلامی سے بخوبی واقف تھے۔وہ جب مصر گئے تو شیخ محمد عبدہٗ سے ملے اور مختلف امور پر تبادلۂ خیال کیا۔افغانی نے قیامِ حیدرآباد کے دوران ایک فارسی رسالہ ردِ نیچریہ سید احمد خاں کی تفسیر کے خلاف لکھا تھا' شیخ محمد عبدہٗ نے عربی میں اس کا ترجمہ ''رد دہریین'' کے نام سے کیا تھا اور اس کے شروع میں افغانی کے حالات بھی لکھے تھے،شبلی نعمانی نے اپنے سفرنامے میں ان حالات کے اقتباسات کو بھی نقل کیا اور شیخ محمد عبدہٗ کی مہارتِ فن اور زورِ تحریر کی تعریف کر کے اربابِ فن کو مشورہ دیا تھا کہ وہ عبدہٗ کے طرز کی تقلید کریں۔(۱۰) افغانی کے اسی اثر نے شبلی کو سید احمد خان سے زیادہ بدظن کر دیا اور محمد عبدہٗ نے انھیں ایک ایسا راستہ دکھایا جسے وہ احیاے دین اور اسلامی تعلیم کا واحد طریق کار سمجھنے لگے۔(۱۱) آگے چل کر اسلامی ممالک پر انگریزوں کی چیرہ دستیوں، ہندوستان میں ہندو مسلم تفریق کی پالیسی اور مسلمانوں کو سیاست اور دیگر ترقی پسند عناصر سے الگ رکھنے کی ترکیبوں نے شبلی کو جمال الدین افغانی کے اتحاد اسلامی کے جدید رجحانات کا اسیر بنا دیا۔

شبلی اصلاحی جدوجہد اپنے مخصوص ماحول میں اسلامی سطح پر کرنا چاہتے تھے۔علی گڑھ اور شبلی کا مطمحِ نظر قوم کی ذہنی تربیت اور طریق کار تعلیم و تدریس تھا۔اس معاملے میں بھی شبلی نے دارالعلوم ندوہ پر اکتفا نہیں کیا۔دارالمصنّفین کے نام سے ایک دینی اور علمی درس گاہ کا نقشہ ترتیب دیا۔

شبلی کے تدبر اور بین الاسلامیت کی سب سے بڑی یادگار اور اسلامی جدوجہد کا مظہر یہی ادارہ قرار پا سکتا ہے جس کے کارناموں نے ہندوستان سے باہر اسلامی ملکوں میں بھی اسلامی علوم کے احیا کا راستہ ہموار کیا،اور بعض معرکہ آرا تصنیفات کے ذریعے یہ ادارہ علمی نشأۃ ثانیہ کا ایک نشان بن گیا۔(۱۲) شبلی کے اس ادارے کو ہندوستان کے جدید تر رجحانات کا حامل اسلامی اتحاد کا مرکز قرار دیا جا سکتا ہے۔

دارالمصنّفین اصل میں شبلی کے رجحانات کا صحیح عکاس معلوم ہوتا ہے۔ندوہ جو جدید اور قدیم تر ہیئتوں کے امتزاج کو بروئے کار لانے کے لیے بنایا گیا تھا،اس کا جھکاؤ روز بروز قدیم نظام کی طرف مائل ہوتا چلا گیا اس نے وہ امتزاج پیدا نہیں کیا جس کی خواہش شبلی کو تھی۔(۱۳) یہ ادارہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۵ء تک اردو میں لکھے گئے دینیاتی ادب پر چھایا رہا اور اس نے بین الاسلامیت کو فروغ دینے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔اس ادارے نے بڑے بڑے رہ نما پیدا کیے جو حقیقتاً اتحاد بین المسلمین کے بھی داعی تھے اور جن کی تحریروں میں شبلی کا قائم کردہ اصول جاری و ساری رہا،ان کا ماننا یہ تھا کہ جدید علوم کی مدد سے مذہب کی حفاظت کی جائے،مگر بزرگانِ سلف کا سررشتہ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔بعد میں اقبال نے بھی اسی طریقۂ کار سے روشنی حاصل کی مگر وہ اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید میں سید احمد خان کے زیادہ قریب چلے گئے۔(۱۴)

یادگارِ شبلی میں شیخ محمد اکرام نے سید احمد خان اور شبلی کے اختلافات کو بے بنیاد قرار دیا ہے اور شبلی کے کام کو سید احمد خان کے کام کا تسلسل کہا ہے۔ شبلی کے کام کو سید احمد خان کے کام کا تسلسل کہنا کسی حد تک تو درست ہے مگر اختلافات کو بے بنیاد قرار دینا ٹھیک نہیں کیوں کہ دونوں کے اختلافات میں کوئی ایک امر بھی پوشیدہ نہیں ہے۔

شبلی کو عالم اسلام سے جو دلی وابستگی تھی اس میں ایک نکتہ ایسا بھی ہے جس کی جانب محققین کی نگاہ کم پڑی ہے۔ ۱۸۸۴ء میں ولفرڈ اسکاوَن بلنٹ (Wilfrid Scawen Blunt) جس کے افغانی سے خصوصی تعلقات تھے اور جو *The Future of Islam* نامی کتاب کا بھی مصنف تھا، اپنے دورۂ ہندوستان میں علی گڑھ بھی گیا۔ وہ سید احمد خان کے طریقِ کار کے خلاف تھا۔ اور اس کا منصوبہ تھا کہ حیدرآباد دکن میں ایک قدیم طرز کی مشرقی یونی ورسٹی قائم کی جائے۔[۱۵] شبلی پر بلنٹ کے اثرات کا اگر اندازہ لگانا ہو تو اس کے دورۂ علی گڑھ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس دورے نے نہ صرف اتحادِ اسلامی کے ایک بڑے داعی کو سرگرمِ عمل کیا بلکہ وہ ان کی شخصیت میں تبدیلی کا محرک بھی بنا۔ شبلی کی شخصیت میں چوں کہ قدامت کا رجحان ہمیشہ غالب رہا اس لیے وہ انگریز خواں طبقے سے دلی طور پر آزردہ تھے مگر بلنٹ نے بھی انھیں قدامت کی جانب پیش قدمی کا مشورہ دیا تو یہ ان کی روح کی آواز معلوم ہوئی اور پھر انھوں نے کسی پس وپیش کے بغیر اس جانب مراجعت اختیار کی۔

دورۂ ہندوستان میں بلنٹ کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی جو خود بھی عربی زبان کے ماہروں میں شمار کی جاتی تھی۔ شبلی نے اپنے بھائی مہدی حسن کو جس کے کافی اچھے مراسم بلنٹ سے استوار ہو گئے تھے، ایک خط میں لیڈی بلنٹ کی تعریف کی ہے، یہ خط ۳۰/اپریل ۱۸۸۵ء کا ہے۔ شیخ محمد اکرام نے بھی بلنٹ اور لیڈی بلنٹ سے شبلی کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے مہدی حسن کے خط کا حوالہ دیا ہے۔[۱۶] بلنٹ کی ڈائری *India under Ripon* میں مہدی حسن کا ذکر کئی مقامات پر ملتا ہے، گو شبلی کا ذکر کسی بھی مقام پر نہیں کیا گیا، لیکن شبلی جن صاحبان سے متاثر تھے ان میں افغانی اور عبدہٗ شامل تھے اور بلنٹ کے ان سے دیرینہ مراسم تھے۔ بلکہ افغانی لندن میں بلنٹ ہی کے گھر پر رہتے تھے۔[۱۷]

علی گڑھ کے تعلیمی ادارے سے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے بلنٹ نے لکھا ہے کہ ''دوسرے مقامات کے مقابلے میں یہاں جلسہ ناکام رہا، بہت سے قدیم وضع کے مولوی اس لیے نہیں آئے کہ یہ جلسہ سید احمد کی طرف سے کیا گیا تھا اس پر بھی میں نے عربی میں ایک لکچر پیش کیا، میں نہیں کہہ سکتا کہ سید احمد خان کو میرا لکچر پسند آیا کہ نہیں۔''[۱۸] یہاں پر کئی ایسے سوالات ہیں جن کا جواب تاریخ کے صفحات پر تلاش کیا جانا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ بلنٹ آخر قدیم طرز کی یونی ورسٹی کیوں قائم کرنا چاہتا تھا جب کہ اس کی کتاب مستقبلِ اسلام کا اردو ترجمہ اکبرالہ آبادی نے کیا تو حیران ہو کر کہتا ہے کہ مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ اس کتاب کو قدیم طرز فکر کے لوگوں نے پسند

کیا ہے۔شبلی پر بلنٹ کے اثرات سے انکار ممکن نہیں ہے کیوں کہ بلنٹ اور شبلی کے خیالات میں کافی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اپنے ایک خط میں شبلی، مولوی مسعود علی ندوی کو لکھتے ہیں کہ ''مولوی عبد الماجد دریا بادی سے کہو کہ وہ انگریزی کتابوں میں مسٹر بلنٹ کی ایک کتاب بھیج دیں۔''(۱۹) غالباً یہ کتاب *The Future of Islam* ہی ہوگی۔

شبلی نعمانی تحریکِ اتحادِ اسلامی کے اصل داعی کے روپ میں ۱۸۷۷ء میں روس و ترک جنگ کے دوران ہی میں ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔اس جنگ نے اسلامی دنیا میں آگ سی لگا دی، ہر جگہ سلطان عبد الحمید کی فتح و نصرت کی دعائیں مانگی جانے لگیں، زخمیوں کے لیے چندے جمع کیے جانے لگے اور سلطان کی حمایت میں بڑے زور و شور سے تقریریں کی جانے لگیں۔ یہ شبلی نعمانی کا شباب تھا۔اس جنگ نے ان کے تمام قویٰ کو مشتعل کر کے رکھ دیا۔ انھوں نے بڑی مستعدی سے اعظم گڑھ میں چندہ جمع کرنا شروع کر دیا اور بمبئی میں ترکی سفیر ''حسین حبیب آفندی'' کے ذریعے ترکی روانہ کیا۔(۲۰) شبلی اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں:

> حسین حبیب آفندی جو کسی زمانے میں ترکش قونصل تھے اور اب قسطنطنیہ میں پولیس کمشنر ہیں وہ مجھ کو اس ذریعے سے جانتے تھے کہ محاربہ روس میں، میں نے بہ حیثیت سیکریٹری انجمن تین ہزار کی رقم ان کے ذریعے ترکی روانہ کی تھی۔(۲۱)

اس سفرنامے میں شبلی عثمان غازی پاشا کا ذکر ایسے لفظوں میں کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خلافتِ عثمانیہ کی بقا کو عالم اسلام کے لیے کتنا اہم جانتے ہیں۔ ۱۸۹۲ء ان کے اس سفر کا سال ہے جنگ پلونا ۱۸۷۷ء میں لڑی گئی اور اسی جنگ میں عثمان پاشا نے اپنے شجاعانہ کارناموں سے اہلِ اسلام کے دل جیت لیے تھے۔شبلی نے جب یہ سفرنامہ لکھا تو انھوں نے عثمان غازی پاشا کا ذکر اس انداز میں کیا جیسے ان کی یاد ان کے دل میں اسی طرح باقی ہے۔(۲۲)

شبلی کے دل میں اسی زمانے سے اتحادِ اسلامی کا جذبہ پیدا ہوا اور آنے والے تمام واقعات جس میں سید احمد خان سے اختلافات شدید تر ہو گئے، ان میں ایک بنیادی وجہ اتحادِ اسلامی کا جذبہ بھی تھا، جو شبلی میں کافی جڑ پکڑ چکا تھا۔(۲۳) ۱۸۵۷ء کے بعد سید احمد خان کے نزدیک مسلمانوں کی بیماریوں کا علاج یہ تھا کہ مذہب کے سوا ہر چیز میں مسلمان انگریز ہو جائیں اور شبلی کے نزدیک یہ تھا کہ صحیح اسلامی عقائد و اخلاق کی حفاظت اور بقا کے ساتھ ساتھ نئے زمانے کی صرف مفید باتوں کو قبول کیا جائے۔ اس سلسلے میں ندوۃ العلما میں وہ اپنے رفقائے کار کی مخالفت بھی گوارا کر چکے تھے جو انگریزی زبان سیکھنے اور سکھانے کے حوالے سے پیش آئی تھی۔(۲۴)

سید احمد اور شبلی کے اختلافات کے سلسلے کی ایک کڑی یہ تھی کہ شبلی نے ندوہ کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں۔ آگے بڑھتے جائیں، لیکن مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ پیچھے

ہٹتے جائیں، پیچھے ہٹتے جائیں۔ یہاں تک کہ صحابہ کی صف سے جا کر مل جائیں۔''[۲۵] سید احمد خان کو یہ تقریر ناپسند آئی اور اس پر انھوں نے غصہ کیا' کیوں کہ ان کا یہ خیال تھا کہ اس وقت مسلمانوں کو اس قسم کی نصیحت ان کے راستے سے پیچھے ہٹا دے گی جس پر وہ لے جانا چاہتے ہیں۔ چناں چہ انھوں نے اس کے خلاف نہایت سخت مضمون لکھا۔[۲۶]

سید احمد خان کا نیک نیتی سے یہ خیال تھا کہ علی گڑھ کالج کے طلبہ میں بلند ہمتی اور بلند خیالی کے لیے یہ ضروری ہے کہ انگریزی طور طریق اور وضع قطع اختیار کریں تا کہ ان میں حاکمانہ روح پیدا ہو' مگر یہ خیال کرتے وقت ان کے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ شیر کی کھال پہن کر کوئی شیر نہیں بن سکتا۔ دوسرا نقصان اس کا یہ ہوا کہ حاکم سے ملنے کے جنون میں وہ اپنی قوم سے دور ہوتے گئے کیوں کہ قدیم اور جدید کی ہم آہنگی سے ایسی صورتیں ظہور میں آئیں جو الم ناک اور مضحکہ خیز تھیں۔ غیر متوقع غلطیاں اور بے ربطیاں ایسی ہی صورت حال کو جنم دیتی ہیں۔ مسلمانوں نے جب مغربی رسوم و روایات کو اپنایا تو اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے تھے۔[۲۷] اسی مضحکہ خیزی کی جانب اکبر الٰہ آبادی نے اپنی شاعری میں طنزیہ اشارے کیے ہیں۔

مسلمانوں میں انگریزوں کے طور طریق کی نقالی میں ان کی زندگی کا سرو سامان اتنا گراں ہو گیا کہ قوم کے کام کا نہیں رہا اور وہ تعلیم جو قوم کی دولت مندی کی خاطر ان کو دی گئی تھی وہ تنگ دستی کا ذریعہ بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ سید احمد خان کی صف میں موجود لوگوں نے اس رویے کے خلاف آواز بلند کی۔[۲۸] اس کا اظہار علی گڑھ کے تعلیمی مزاج سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ سید احمد خان کے اس عمل اور خیال سے شبلی نے اپنے لیے الگ راہ نکالی۔ مولوی مسعود علی ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''سید احمد سے مجھ کو اصولی امر میں اختلاف ہے۔''[۲۹] اور یہ کہ ''میں تیس برس سے مسلمانوں کی حالت پر غور کر رہا ہوں، خوب دیکھا اصلی ترقی کا مانع وہی گراں زندگی ہے جو سید احمد خان سکھا گئے ہیں۔''[۳۰]

یہی وجہ ہے سید احمد کی وفات پر ان کی زندگی کے کارناموں پر جب مختلف مضامین کا لکھا جانا طے ہوا اور اس سلسلے میں سرسید اور مذہب کا عنوان شبلی نعمانی کے لیے طے ہوا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ آخر لوگوں کے اصرار پر شبلی نے مجبور ہو کر سرسید اور اردو لٹریچر کا دوسرا عنوان لیا اور پہلے عنوان پر حالی نے لکھا۔ یہ دونوں مضمون ایک ساتھ علی گڑھ میگزین کے مئی ۱۸۹۸ء کے نمبر میں شائع ہوئے۔[۳۱]

ان دونوں اصحاب کے مابین اختلافات اتنے شدید ہو گئے تھے کہ جب سیّد احمد خان کی سوانح عمری لکھنے کے لیے شبلی سے کہا گیا تو وہ اسے مختلف حیلے حوالے سے ٹالتے رہے۔[۳۲] ان دونوں کے اختلافات کا دوسرا باب بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ تعلیمی نقطۂ نظر کے حوالے سے وہ سید احمد خان سے کافی اختلافات رکھتے تھے۔ سید احمد خاں جدید تعلیم کے علاوہ مسلمانوں کی ہر ایسی تعلیم کو دور از کار سمجھتے تھے جو انگریزی نظامِ تعلیم کی راہ میں رکاوٹ ہو۔ اسی لیے پنجاب

میں ۱۸۸۲ء میں مشرقی تعلیم کا جو نظام ترتیب پا رہا تھا اس کی مخالفت میں اتنے سخت ہو گئے کہ اس کے پرزے اُڑ گئے۔ ۱۸۸۹ء میں الٰہ آباد میں مشرقی امتحانات کے اجرا پر ایسی ہی مخالفت کی، بہرحال ان کو مشرقی علوم سے اور عربی علوم سے دل چسپی نہیں تھی۔[۳۳] اس کا اظہار ان کے ایک مضمون میں بھی کیا گیا ہے۔[۳۴]

شبلی نعمانی کا اس معاملے میں عقیدہ یہ تھا کہ اگر مشرقی علوم اور عربی تعلیم نہ رہی تو پھر مسلمان رہیں گے کہاں؟ جن کی ترقی کے لیے جد و جہد ہو رہی ہے۔ ۱۸۹۴ء میں جب دارالعلوم ندوۃ العلما قائم ہوا تو شبلی کی عین تمنا کے مطابق تھا۔ اس لیے انھوں نے اس کی صدا پر لبیک کہا' بلکہ وہ ان کی زندگی کا مقصد بن گیا۔[۳۵] ایک بات دارالعلوم ندوہ کے حوالے سے انتہائی حیرت ناک بھی ہے اور شبلی کی شخصیت کے اثرات کو اتحاد بین المسلمین کے تناظر میں سمجھنے کے حوالے سے معاون بھی۔ خدا بخش جرنل میں شہزادہ جان میلکم کے شبلی نعمانی پر لکھے ہوئے مضمون کا اردو ترجمہ ملتا ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کی اس مضمون کا جو اردو ترجمہ ہے اس کا کوئی حوالہ موجود نہیں ہے اور کس نے ترجمہ کیا ہے اس کا بھی ذکر اس مضمون میں نہیں کیا گیا۔ جان میلکم کے افغانی کے ساتھ نہایت گہرے مراسم تھے۔ وہ دارالعلوم ندوہ کے حوالے سے لکھتا ہے کہ ''شبلی نعمانی ایک ایسے بڑے کام میں مشغول ہیں کہ اگر یہ کام مکمل ہو گیا تو سمجھ لینا چاہیے کہ مشرق میں ایک نئے دور کا آغاز مسلمانوں پر ہوگا، اگر ندوہ فی الحقیقت کامیاب ہو گیا۔ دارالعلوم ندوہ مسلمانوں کا ایسا ادارہ ہے جس پر ٹھیٹھ اسلامی ہونے کا اطلاق ہوسکتا ہے۔''[۳۶]

شبلی کی بین الاسلامیت کا مکمل اظہار ان کی تحریروں میں پایا جاتا ہے۔ شبلی نے اردو میں اسلامی تاریخ نویسی کی جو روایت قائم کی اس میں بھی احیاے اسلام کا گہرا قدامت پسندانہ رنگ نمایاں ہے۔ انھوں نے جن اصولوں کو مدِنظر رکھا، وہ بہ حیثیت مجموعی روایتی اسلامی وقائع نگاری سے مرکب تھے۔[۳۷] شبلی کے پیشِ نظر بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو ان کے بزرگوں کے کارناموں سے روشناس کروایا جائے تاکہ وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کی بجائے اپنے ماضی اور اسلاف پر فخر کر سکیں۔

شبلی نعمانی خلافتِ راشدہ کے اصولِ انتخاب کی بنا پر فطری طور پر جمہوری تھے۔ جب کہ سید احمد خان شخصی حکومت کو پسند کرتے تھے۔ علی گڑھ کالج میں طلبہ کی ایک مجلس میں شبلی نعمانی نے جمہوری طرزِ سلطنت کی تائید میں ایک تقریر کی، جس کے زورِ بیاں سے متاثر ہو کر حاضرین نے تعریف کی۔ حاضرین میں سید احمد خاں بھی موجود تھے انھوں نے نہ صرف اس کی مخالفت کی بلکہ ایک مضمون اس تقریر کے رد میں لکھا۔ جو انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۸/جون ۱۸۹۲ء کے پرچے میں ایشیائی اور اسلامی طرزِ حکومت کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس ایک معمولی واقعے سے بھی شبلی اور سید احمد کا سیاسی اختلاف معلوم ہوتا ہے۔ ۱۸۹۷ء میں روم و یونان کی جو لڑائی ہوئی اور اس میں انگریزوں کی مرضی

کے خلاف ترکوں کو جو فتح نصیب ہوئی اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو پر جوش بنا دیا تھا۔سارے ہندوستان میں اس کی خوشی منائی گئی اور بمبئی کے مسلمانوں نے چراغاں کیا، سید احمد خان کو اس پر اعتراض تھا اور انھوں نے اس جوش و مسرت کے خلاف دو نہایت سخت مضامین لکھے۔جس کے عنوان یونان اور ترک اورسلطان اور ہندوستان کے مسلمان تھے۔(۳۸) اتحادِ اسلامی کے حامی مسلمانوں کو یہ مضامین تیر کی طرح آ کر لگے اور انھوں نے سید احمد کی اس انگریز دوستی پر سخت اعتراضات کیے۔

شبلی کو ساری دنیا میں ترکی ہی وہ سلطنت دکھائی دیتی تھی جس کے پیکر میں ان کو اسلامی شان وشوکت کا جلوہ نظر آتا تھا۔اس لیے وہ ترکوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔اسی محبت کے نتیجے میں انھوں نے اس ملک کا سفر بھی کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکوں کا نام لینا برٹش گورنمنٹ آف انڈیا کی نگاہ میں بڑا جرم تھا۔شبلی نے اس جرم کا ارتکاب کیا۔ترکی کے سفرنامے کی ترتیب میں شبلی نے علمی وتعلیمی پہلو کو پیش کیا ہے' سیاسیات کو ہاتھ بھی نہیں لگایا مگر یہ جرم بھی عفو درگزر سے نہیں دیکھا گیا،ان کو سلطانی ایلچی ہونے کا ملزم ٹھہرایا گیا اور ان کے پیچھے خفیہ پولیس لگائی گئی۔(۳۹)

شبلی کی بہت کم مجلسیں ترکوں کے فضائل ومناقب اور دل چسپ قصوں کے بیان سے خالی ہوتی تھیں اور جب وہ بیان کرنے پر آتے تھے تو بلبل ہزار داستان بن جاتے تھے۔(۴۰) ترکوں سے محبت کا یہ عالم تھا کہ جب ترکی گئے تو وہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات کی، وہاں کے اخبارات اور ان کی اشاعت سے متاثر ہوکر ترکی زبان سیکھنی شروع کردی۔ ملّا محمد آفندی موصل کے رہنے والے عرب تھے جو فارسی اچھی طرح جانتے تھے مولانا نے ان سے ترکی سیکھنی شروع کردی۔اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ ٹوٹی پھوٹی ترکی میں نے سیکھ لی۔ وہ اب محفوظ نہیں ہے۔(۴۱)

۱۹۰۸ء میں جب انور بے نے ترکی میں دستوریت کا اعلان کیا تو شبلی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ایک ایک نامور نوجوان ترک اور انجمن اتحاد وترقی کے ایک ایک جاں باز رکن کی تعریفیں کرتے تھے۔سلطان عبدالحمید کی اس معاملہ فہمی کی مدح کرتے تھے کہ اُس نے محمد علی شاہِ کج کلاہ ایران کی طرح اپنے ملک کو خانہ جنگی میں برباد نہیں کردیا بلکہ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر ملک میں اتنا بڑا انقلاب ہونے دیا۔انھیں اس انقلاب سے بڑی توقعات تھیں۔(۴۲) شبلی زندہ نہ رہے ورنہ دیکھتے کہ خلافت کے خاتمے میں اس انجمن نے وہ کردار ادا کیا کہ ساری دنیا کے مسلمان حیرت میں مبتلا ہوگئے۔ درحقیقت انجمن اتحاد وترقی کے سرکردہ افراد مغربی طاقتوں کے آلۂ کار تھے۔بعد میں جو تحقیقات ہوئیں ان سے یہ ثابت ہوا ہے کہ سلطان عبدالحمید کے خلاف اس انجمن کے ذریعے بھیانک سازش تیار کی گئی جو اس کی معزولی پر جاکر ختم ہوئی۔(۴۳)

۱۸۸۹ء میں انقلابِ فرانس کے پورے سو سال بعد معاشرے میں پھیلی ہوئی آزاد خیالی، جمہوریت اور آئینی

حکومت کے نظریات عثمانی سلطنت میں جڑ پکڑ چکے تھے۔[۴۴] انھیں عوامل کی بنا پر ۱۹۰۸ء میں ابراہیم تیمور کی قائم کردہ خفیہ جماعت ''انجمن اتحاد و ترقی''[۴۵] نے دستوریت کا حق مانگا، جس نے خلافتِ عثمانیہ کو ختم کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا، مگر اس وقت کے ہندوستانی مسلمان اس سازش کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

۱۹۱۱ء میں جب اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تو شبلی کے دل کو ٹھیس لگی اس زمانے میں انھوں نے اس جنگ کے حوالے سے کئی نظمیں لکھی ہیں۔[۴۶] جنگِ بلقان کے دوران میں ڈاکٹر انصاری کا میڈیکل مشن مولانا محمد علی کے فراہم کردہ سرمائے سے جب ترکی گیا تو شبلی اس کی روانگی پر اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکے اور بے اختیار جھک کر ڈاکٹر انصاری کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔[۴۷]

اس زمانے میں بقرعید آ گئی، شبلی کی رائے یہ تھی کہ مسلمانانِ ہند اس سال قربانی کی رقم ترکی فنڈ میں داخل کر دیں۔ فقہ کی رو سے انھیں اس میں کوئی امر مانع نظر نہیں آتا تھا۔ مفتی عبداللہ ٹونکی اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے بھی تائید کی۔ شبلی نے اپنا فتویٰ بھی اخبارات میں شائع کرایا۔[۴۸] جس پر دھڑا دھڑ روپیہ اس فنڈ میں جمع ہونے لگا۔

شبلی کی سیاسی زندگی کا محور و مرکز خواہ کچھ بھی ہو، مگر ان کی مجموعی قدر و قیمت اور غرض و غایت یہی تھی کہ مسلمانوں کے علم و ادب سے دنیا کو روشناس کرایا جائے۔[۴۹] شبلی کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بدلے ہوئے حالات میں جب کہ قوم مغرب سے مرعوب ہو کر شدید ذہنی غلامی میں مبتلا ہو چکی تھی ایک ایسا لائحۂ عمل پیش کیا جس میں ایک طرف قدیم و جدید کی خوش گوار آمیزش تھی اور دوسری طرف علومِ اسلامیہ کے احیا کے ذریعے ملک میں علمی اور ذہنی انقلاب پیدا کرنا تھا۔[۵۰]

سید احمد خاں مغرب کے افکارِ جدید کے مخلص معتقد تھے۔ شبلی ان علوم سے اتنا ہی استفادہ کرنا چاہتے تھے جتنا کہ بدلے ہوئے حالات متقاضی تھے۔ شبلی پرانی روشنی کو دوبارہ ضوافگن دیکھنا چاہتے تھے۔ نئی روشنی میں بیٹھ رہنا ان کا نصب العین نہ تھا۔ شبلی جدت کے منکر نہ تھے مگر ماضی کی روایات کو کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار بھی نہ تھے۔ سید احمد خان کا راستہ ان سے جدا تھا۔ شبلی نے پرانے علوم اور قدیم طرزِ فکر سے از سرِ نو دل چسپی پیدا کی اور مغرب کی اندھی تقلید سے منھ موڑ لیا۔[۵۱]

روم و شام کے سفر میں شبلی جہاں جدید اثرات سے متاثر ہوئے وہاں مصر کی علمی لہر سے بھی استفادہ کیا۔ مفتی عبدہٗ، رشید رضا قدیم و جدید کے مابین جس پیوند کاری میں لگے ہوئے تھے شبلی نے وہی کام دارالعلوم ندوہ اور دارالمصنّفین میں انجام دینے کی کوشش کی۔[۵۲] نئی قومی زندگی پیدا کرنے اور اس کو تاریخی بنیادوں پر حوالہ فراہم کرنے میں شبلی کا کردار بے مثل ہے اور ندوۃ العلما اس کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

حواشی

۱۔ عزیز احمد، برصغیر میں اسلامی جدیدیت، مترجم: جمیل جالبی، (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، جون ۱۹۹۷ء) ص ۱۲۱
۲۔ سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، (اعظم گڑھ: در مطبع معارف، ۱۹۴۳ء)، ص ۲۱۱
۳۔ اکرام، شیخ محمد، شبلی نامہ (بمبئی: تاج آفس محمد علی روڈ، سن ندارد)، ص ۲۱۴
۴۔ ایضاً
۵۔ مقالات شبلی، مرتبہ سید سلیمان ندوی، جلد ہشتم، (اعظم گڑھ: در مطبع معارف، ۱۹۳۸ء)، ص ۱۸۵
۶۔ احمد اسحاق نعمانی، شبلی اور سیاست، مشمولہ: ادیب، شبلی نمبر، شمارہ ۹ جلد ۶ علی گڑھ، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۳۶۸، ۳۶۹
۷۔ عبدالمغنی، شبلی و حالی کی تحریکیت، مشمولہ: ادیب، شبلی نمبر، شمارہ ۹ جلد ۶ علی گڑھ، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۲۵۷
۸۔ عزیز احمد، مترجم جمیل جالبی، محولۂ بالا، ص ۱۸۶
۹۔ شیخ محمد اکرام، شبلی نامہ، محولۂ بالا، ص ۲۱۴
۱۰۔ ایضاً، ص ۲۱۵
۱۱۔ ایضاً، ص ۲۲۰
۱۲۔ عبدالمغنی، محولۂ بالا، ص ۲۵۹
۱۳۔ اشتیاق حسین قریشی، بر عظیم پا ک وہند کی ملت اسلامیہ، مترجم: ہلال احمد زبیری، (کراچی: شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۱۹۹۹ء)، ص ۳۳۴
۱۴۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، سرسید احمد خان اور ان کے نام ور رفقا کی اردو نثر کا فنی وفکری جائزہ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۸ء)، ص ۱۹۳
۱۵۔ شیخ محمد اکرام، یادگارِ شبلی، (لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۹۴ء)، ص ۳۱۸
۱۶۔ ولفرڈ اسکاوَن بلنٹ، (Wilfrid Scawen Blunt)، لارڈ رپن کا عہدِ حکومت (India under Rippon: A private Diary)، اردو ترجمہ: ضیاء الدین برنی، مشمولہ ماہ نامہ نگار، لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۲۶ء، ص ۴۲
۱۷۔ ایضاً، ص ۴۳
۱۸۔ ایضاً، ص ۴۳
۱۹۔ سید سلیمان ندوی (مرتّب)، مکاتیبِ شبلی (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع اوّل ۱۹۸۹ء)، ص ۱۲۲
۲۰۔ ایضاً، حیاتِ شبلی، (اعظم گڑھ: در مطبع معارف، ۱۹۴۳ء)، ص ۹۵
۲۱۔ شبلی نعمانی، علامہ، سفرنامۂ روم و مصرو شام، (علی گڑھ: اشاعت دوم، س ن)، ص ۹۵
۲۲۔ ندوی، سید سلیمان، حیاتِ شبلی، محولۂ بالا، ص ۹۶
۲۳۔ ایضاً، ص ۹۶
۲۴۔ شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، (راول پنڈی: سروسز بک کلب، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۷۴
۲۵۔ ایضاً
۲۶۔ سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، محولۂ بالا، ص ۲۹۰
۲۷۔ اشتیاق حسین قریشی، محولۂ بالا ص ۳۳۲

۲۸۔ سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، محولۂ بالا، ص ۲۹۰، ۲۹۱
۲۹۔ ایضاً، مکاتیبِ شبلی، محولۂ بالا، ص ۴۰
۳۰۔ ایضاً، ص ۱۴۰
۳۱۔ سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، محولۂ بالا، ص ۲۹۲
۳۲۔ ایضاً، ص ۲۹۲
۳۳۔ ایضاً، ص ۲۹۲
۳۴۔ شیخ اسماعیل پانی پتی (مرتّب)، مقالاتِ شبلی، (لاہور: مجلس ترقیٔ ادب لاہور، اکتوبر ۱۹۶۲ء)، ص ۶۵
۳۵۔ سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، محولۂ بالا، ص ۲۹۳
۳۶۔ جان میلکم، شبلی نعمانی، مشمولہ خدا بخش جرنل، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۷۸ء، ص ۶۵، ۶۶
۳۷۔ عزیز احمد، محولۂ بالا، ص ۱۲۲
۳۸۔ سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، محولۂ بالا، ص ۲۹۵
۳۹۔ ایضاً، ص ۵۸۷
۴۰۔ ایضاً، ص ۵۷۷
۴۱۔ ایضاً، ص ۲۰۳
۴۲۔ ایضاً، ص ۵۸۸
۴۳۔ خلیل طوق آر، ترک اور ترکی، (اسلام آباد: نیریٹو پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۳۴
۴۴۔ مزمل یٰسین، سلطنتِ عثمانیہ کی انقلابی تحریکیں، (کراچی: انجمن ترقیٔ اردو پاکستان، ۱۹۷۳ء)، ص ۴۳
۴۵۔ ایضاً، ص ۴۳
۴۶۔ اشتیاق حسین قریشی، محولۂ بالا، ص ۳۳۳
۴۷۔ رئیس احمد جعفری، اوراقِ گم گشتہ، (کراچی: رئیس احمد جعفری اکیڈمی ۱۹۷۱ء)، ص ۳۱۶
۴۸۔ ایضاً، ص ۳۱۷
۴۹۔ عبداللہ، سیّد، محولۂ بالا، ص ۲۲۳
۵۰۔ ایضاً، ص ۲۲۵
۵۱۔ ایضاً، ص ۲۲۶
۵۲۔ ایضاً

مآخذ

۱۔ احمد، عزیز، برصغیر میں اسلامی جدیدیت، مترجم: جمیل جالبی، لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۹۷ء۔
۲۔ اکرام، شیخ محمد، شبلی نامہ بمبئی: تاج آفس محمد علی روڈ، سن ندارد۔
۳۔ _____، یادگارِ شبلی، لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۹۴ء۔

۴۔ _____، موجِ کوثر، راول پنڈی: سروسز بک کلب ۲۰۰۴ء۔
۵۔ بلنٹ، ولفرڈ اسکاوَن (Blunt, Wilfrid Scawen)، لارڈ رپن کا عہدِ حکومت (India under Rippon: A private Diary)، اردو ترجمہ: ضیاء الدین برنی، مشمولہ ماہ نامہ نگار، لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۲۶ء۔
۶۔ پانی پتی، شیخ اسماعیل (مرتّب)، مقالاتِ شبلی، لاہور: مجلس ترقیٔ ادب لاہور، اکتوبر ۱۹۶۲ء۔
۷۔ جان میلکم، شبلی نعمانی، مشمولہ خدا بخش جرنل، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۷۸ء۔
۸۔ خلیل طوق آر، ترک اور ترکی، اسلام آباد: نیریٹو پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء۔
۹۔ رئیس احمد جعفری، اوراقِ گم گشتہ، کراچی: رئیس احمد جعفری اکیڈمی، ۱۹۷۱ء۔
۱۰۔ شبلی نعمانی، علامہ، سفرنامۂ روم و مصرو شام، علی گڑھ، اشاعت دوم، س ن۔
۱۱۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، سرسید احمد خان اور ان کے نام ور رفقا کی اردو نثر کا فنی و فکری جائزہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء۔
۱۲۔ عبدالمغنی، شبلی و حالی کی تحریکیت، مشمولہ: ادیب، شبلی نمبر، شمارہ ۹ جلد ۶، علی گڑھ، ستمبر ۱۹۶۰ء۔
۱۳۔ قریشی، اشتیاق حسین، برعظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ، مترجم: ہلال احمد زبیری، کراچی: شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۱۹۹۹ء۔
۱۴۔ مزمل یٰسین، سلطنتِ عثمانیہ کی انقلابی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقیٔ اردو پاکستان، ۱۹۷۳ء۔
۱۵۔ نعمانی، احمد اسحاق، شبلی اور سیاست، مشمولہ: ادیب، شبلی نمبر، شمارہ ۹ جلد ۶، علی گڑھ، ستمبر ۱۹۶۰ء۔
۱۶۔ ندوی، سید سلیمان، حیاتِ شبلی، اعظم گڑھ: در مطبع معارف، ۱۹۴۳ء۔
۱۷۔ _____ (مرتّب)، مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، اعظم گڑھ: در مطبع معارف ۱۹۳۸ء۔
۱۸۔ _____ (مرتّب)، مکاتیبِ شبلی، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع اوّل ۱۹۸۹ء۔